نیلا پتھر

از

احمد ندیم قاسمی

بہت پیارے

گلزار

کے نام

جو فلمی ہدایت کاری، گیت

نگاری اور مکالمہ نویسی میں غیر

فانی شہرت رکھنے کے علاوہ ایک

بڑے افسانہ نگار بھی ہیں

ترتیب

احسان

دھوپ نشہ آور تھی مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

اس وقت آسمان اتنا نیلا ہو رہا تھا جیسے اسے چھو لو تو، پوریں نیلی پڑ جائیں۔ سورج مشرق میں پینتالیس کے زاویئے پر تھا۔ رات کی بارش میں اینٹوں کی چھت دھل گئی تھی اور دھوپ نے اینٹوں کو صیقل کر دیا تھا۔ اتنی کھلی چھت میں ایک کرسی اور ایک تپائی رکھ کر اخبار پڑھنے لگا تو وہ مجھے اجنبی سا لگا۔ سو میں نیچے جا کر ایک رسالہ اٹھا لایا اور تب دھوپ کو شرارت سوجھی اور میں غنودہ سا ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے اپنے پپوٹے لہو کی طرح لال نظر آئے۔ میں نے سوچا کتنی عجیب بات ہے کہ ہم بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں جیسے اس وقت میں اپنے پپوٹے دیکھ رہا ہوں۔ کوشش کی جائے تو بند پپوٹوں سے شاید اور بھی بہت کچھ دیکھا جا سکتا ہو۔

میں نے غنودگی سے جنگ کرنے کی ٹھانی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو میں نے ناشتہ کیا تھا۔ یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔ یہ علم الابدان کا کوئی راز ہو گا کہ جب سرما کی دھوپ میں انسان اپنی نظریں کتاب پر یا کسی ایک نقطے پر مرکوز کر دے تو اسے نیند آنے لگتی ہے۔ نیند سے بچنے کے لئے میں رسالے کی ایک غزل گنگنانے لگا، مگر میری گنگناہٹ بہت مدھم تھی۔ ممکن ہے پڑوس کی چھت کے درمیان جو حد فاصل تھی وہ انسان کے اوسط قد سے بھی ہاتھ بھر اونچی تھی۔ پھر جہاں پردے کے سلسلے میں اتنی احتیاط برتی گئی ہو، وہاں بلند آواز میں گنگنانا معیوب ہی ٹھہرے گا۔

دھپ دھپ کی آواز سے میں چونکا۔ پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اٹھ کر نیچے صحن میں جھانکا۔ میرے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں پلٹا تو دھپ دھپ کی ایک اور آواز آئی۔ اب میں نے اس کی سمت معین کر لی تھی۔ یہ آواز چھتوں کی حد فاصل کی دوسری جانب سے آ رہی تھی۔ میں سمجھا بچے کھیل رہے ہیں سو واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک بار پھر دھپ دھپ ہوئی اور پھر ایک نسوانی آواز آئی! ''سنیئے!''

میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور پوچھا۔ ''جی۔ آپ مجھ سے تو مخاطب نہیں ہیں؟''

''آپ ہی سے مخاطب ہوں۔'' آواز آئی۔ ''مجھے معلوم ہے آپ اس مکان میں دو چار روز پہلے ہی تشریف لائے ہیں اور آپ سے کوئی جان پہچان بھی نہیں مگر سوچا آپ کو تکلیف دے کر دیکھتی ہوں۔ آپ کا کوئی ملازم ہے گھر کے کام کاج کے لئے؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہوٹل سے کھانا کھا لیتا ہوں۔''

''اس وقت آپ کے پاس کوئی دوست بیٹھے ہوں تو ان سے کہہ دیجیے۔''

''جی نہیں۔''میں نے بتایا۔''اکیلا ہوں، مگر آپ کہیئے تو، کوئی کام ہے کیا؟''

''جی ہاں۔'' آواز آئی۔ میرے اباجی پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور گھر میں صرف میں ہوں۔ دن کا وقت ہے اور میں پردہ کرتی ہوں۔ ایک دوائی لانی ہے دوکان سے نسخہ میرے پاس ہے۔ کیا آپ تکلیف کر سکیں گے؟''

''بخوشی۔''میں نے کہا۔''میں ادھر گلی میں آپ کے دروازے پر آتا ہوں۔ نسخہ دے دیجیئے۔ تو میں ایک منٹ میں دوا لاتا ہوں۔ دواؤں کی دوکان تو چند قدم پر ہے۔۔۔گلی کے موڑ پر۔''

''خدا آپ کا بھلا کرے۔''

میں فوراً گلی میں آیا اور پڑوس کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر پردے کے لئے ایک پرانا پلنگ پوش آویزاں تھا۔ اپنی موجودگی کا بتانے کے لیے میں کھنکارا تو دبی دبی آواز آئی۔''اچھا آپ تشریف لے آئے! یہ لیجیے۔''

ایک ہاتھ لٹکی ہوئی چادر کے ایک طرف سے نکلا۔ سانولا۔ سانولا اور تازہ تازہ سا جیسے ابھی دھل کر نکلا ہے۔ ہاتھ چاہے میلا ہو چاہے صاف۔ سانولا ہو چاہے سفید، انسان کی عمر بتا دیتا ہے۔ لوگ عمروں کے اندازے کے لئے خواہ مخواہ چہروں کو گھورتے رہ جاتے ہیں۔ ہاتھ انسانی عمر کا سچا غماز ہوتا ہے۔ وہ کمپیوٹر کی سی صحت کے ساتھ انسانی عمر کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس سانولے اور تازہ ہاتھ والی کی عمر بیس بائیس برس کے آس پاس ہو گی۔

میں نے اس ہاتھ کے انگوٹھے اور نگشت شہادت کی پوروں کے درمیان تھما ہوا نسخہ اور ایک روپے کا نوٹ لیا اور کہا۔''میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

''جی شکریہ۔'' آواز کو شعوری طور پر دبا کر سرگوشی بنا دیا گیا تھا۔

عام سی دوا تھی۔ میں دو گولیاں لے کر فوراً پلٹا اور ایک بار پھر دروازے پر کھنکارا۔''ارے اتنی جلدی!'' ہاتھ چادر کے ایک طرف سے باہر آیا۔''خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے بڑا احسان کیا ہے۔''

''احسان!''میں نے حیرت سے کہا اور گولیاں نسخے سمیت ہتھیلی پر رکھ دیں۔

''احسان کا وزن تو بہت بھاری ہوتا ہے۔ بی بی۔ ان دو گولیوں کا وزن تو احسان کے وزن کے پاسنگ بھی نہیں۔''

''جی میں گولیوں کے وزن کی بات نہیں کر رہی ہوں۔'' آواز آئی ''ایک اجنبی کے لئے چھت سے اترنے، یہاں آنے اور دوا لانے کا اپنا ایک وزن ہے۔ آپ نے احسان کیا ہے اس لیے وزن کو محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے احسان لیا ہے۔ اس لئے میری گردن احسان کے بار سے جھکی ہوئی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔''

پھر مجھے اس کے جانے کی آواز آئی اور میں نے اپنے گھر کی چھت پر آ کر رسالہ کھول لیا، مگر وہاں سب لوگ حیات و کائنات کے مسائل سمجھنے میں لگے ہوئے تھے۔ میری دستگیری کون کرتا۔ میں نے رسالہ میز پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور پپوٹوں کی لہولہو سرخی کے پار دیکھنے لگا جہاں سے ایک ہاتھ، چٹکی میں کاغذ کا ایک پرزہ لئے، ابھرا اور پھر جیسے لہولہو ہو کر سرخی میں تحلیل ہو گیا۔ ایک بار پھر ابھرا تحلیل ہو گیا۔

پھرا بھرا پھر تحلیل ہو گیا۔۔۔میں نے آنکھیں کھول دیں۔چھوٹی بات!میں نے سوچا۔مجھے لڑکی کا ہاتھ نظر آ رہا ہے مگر اس کا فالج زدہ باپ دکھائی نہیں دے رہا ہے،جس لے لئے دوا لانے والا کوئی نہیں۔

میں رسالے کو بغل میں مار کر نیچے کمرے میں آ گیا۔ہر شے ٹھٹھری ہوئی تھی مگر خود میں کتنا تپ رہا تھا۔ہم مشرقی لوگ بھی عجیب ہونق لوگ ہیں۔اپنے لئے اتنے فلک بوس اخلاقی قلعے تعمیر کرتے ہیں اور پھر تاک میں بیٹھ جاتے ہیں کہ قلعے کی دیوار پھٹے تو باہر کے منظر کی کوئی جھلک نظر آئے۔ہم خود ہی اپنی آنکھوں کو اندھا کر کے عمر بھر اپنے اندھے پن کا علاج ڈھونڈتے رہتے ہیں

شام کو میں گھر سے نکلا تو چار قدم ہی پر پڑوس کا دروازہ تھا جس پر ایک پرانا پلنگ پوش لٹک رہا تھا سوچا،لڑکی کے ابا کی مزاج پرسی کر لینی چاہئے۔پڑوسیوں کے تو ایک دوسرے پر بہت حقوق ہوتے ہیں۔میں نے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔

''کون!''دور سے لڑکی کی آواز آئی۔

''جی میں۔آپ کا پڑوسی۔''میں نے کہا۔''آپ کے اباجی کے مزاج کیسے ہیں؟''

''اچھا تو آپ ہیں!''اس کی آواز میں اطمینان تھا۔''میں اوپر چھت کی دیوار پر بہت دیر سے دھپ دھپ کرتی رہی۔پھر سوچا آپ کہیں چلے گئے ہیں۔''

''جی میں نیچے کمرے میں تھا۔''میں نے کہا۔''آپ میرا دروازہ کھٹکھٹا دیتیں۔''

وہ بولی۔''اس کے لئے مجھے دن کو گلی میں جانا پڑتا اور میں عرض کر چکی ہوں کہ میں پردہ کرتی ہوں۔''

''جی۔''میں مسئلے کی نزاکت سمجھ گیا۔

وہ کہنے لگی۔''اب یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ آپ گلی میں میرے دروازے پر کھڑے ہیں اور میں پردے کے پیچھے سے آپ سے باتیں کر رہی ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے لوگ پرسے کوا بنانے کے فن میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔''

یکا یک مجھے اکھٹا بہت سا احساس جرم ہوا۔میں نے ایک قدم ہٹ کر کہا۔''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔میں چلتا ہوں۔میں تو صرف مزاج پرسی۔۔۔''

''مگر آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں آپ کو کیوں بلا رہی تھی۔''اس نے لٹکتے ہوئے پلنگ پوش کا ایک کنارا ہاتھ میں لے لیا۔کمپیوٹر چلنے لگا۔

''جی،جی۔''میں نے کہا۔''فرمایئے۔میرے لائق کوئی خدمت؟''

''ڈاکٹر کو بلانا ہے۔''اس نے کہا۔''اباجی کی حالت ویسی ہی ہے اور پہاڑ جیسی رات آنے والی ہے۔میں کل شام کے اندھیرے میں برقعہ اوڑھ کر ڈاکٹر عبدالرزاق کو بلا لائی تھی۔انہی کو پھر بلانا ہے۔قریب ہی ہیں۔آپ کو تکلیف ہوگی مگر میں کیا کروں۔اباجی کو تنہا چھوڑتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ڈاکٹر صاحب فوراً آ جائیں گے۔اباجی سے ان کی جان پہچان ہے۔''

''ابھی لاتا ہوں۔''میں نے کہا۔''میں نے ان کے کلینک کا بورڈ دیکھا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب ایک معمر اور نحیف و نزار بزرگ تھے۔ وہ نسخہ لکھ رہے تھے اور تنومند مریض ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ مریض دراصل ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر صاحب دراصل مریض ہیں۔ میں نے جا کر عرض کیا تو فوراً نسخہ مریض کے حوالے کیا، سٹیتھسکوپ اٹھا کر میرے ساتھ چل پڑے۔

میں نے جا کر دستک دی اور ساتھ ہی کہا۔ "ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔"

"جی اچھا" دور سے آواز آئی۔ پھر پلنگ پوش پورے کا پورا اٹھ گیا۔ لڑکی پوری کی پوری میرے سامنے کھڑی تھی۔

میں سمجھا اس نے بدحواسی میں پردہ اٹھا دیا ہے۔ چنانچہ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا تو بولی۔ "کوئی بات نہیں۔ آپ بھی آ جایئے۔ میں نے اباجی کو بتا دیا ہے۔" پھر وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھی۔ "اباجی سن بھی رہے ہیں، دیکھ بھی رہے ہیں، بس بول نہیں سکتے۔

اور جب وہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی تو میرے دل نے گواہی دی کہ کمپیوٹر کا اعلان حرف بہ حرف ،نقطہ بہ نقطہ درست تھا۔

یہ گھر بالکل میرے گھر کے مشابہ تھا۔ گلی میں کھلنے والا دروازہ دراصل پہلے کمرے کا دروازہ تھا۔ دوسرا کمرہ ملحق تھا۔ بغل میں باورچی خانہ اور کائنات ختم۔ اگر حیوانات اشرف المخلوقات ہوتے اور انسان کو پالتو جانوروں کی طرح رکھتے تو ان کے لئے ایسے ہی ڈربے بناتے۔

ڈاکٹر صاحب اور لڑکی تو دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میں پہلے کمرے میں کھڑا یہ سوچتا رہ گیا کہ ایک دن میں ایک جوان پردہ نشین کا یوں بے تکلفی سے سامنے آ جانا ضرورتاً بھی ہو سکتا ہے اور مجبوراً بھی۔ ضرورتاً یوں کہ باپ کی بیماری میں کام آنے والا کوئی تو ہونا چاہیئے اور مجبوراً یوں کہ۔۔۔۔آخر سبھی کے سینے میں دل ہوتا ہے اور باپ بیمار بھی پڑا ہو تو دل کے احکام ٹالے نہیں جا سکتے۔

"آپ کو باہر کھڑے رہ گئے۔" لڑکی دوسرے کمرے کے دروازے میں نمودار ہوئی۔ "اپنوں سے کیا پردہ۔ آ جایئے نا!"

ایک کوندے کی طرح یہ فیصلہ میرے دل و دماغ میں لپک گیا کہ معاملہ ضرورت کا نہیں ہے۔ مجبوری کا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس ایک لمحے میں میرا قد ایک آدھ انچ ضرور بڑھ گیا ہو گا۔

لڑکی کے اباجی خاصے وجیہہ، مگر بے حد کمزور بزرگ تھے۔ چھوٹی سی آدھی سفید آدھی سیاہ ڈاڑھی تھی۔ مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں نے ان کے ہونٹوں کے فرائض انجام دیئے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی یہ مسکراہٹ نظر آ گئی۔ بولے۔ "صبیحہ بیٹی۔ قریشی صاحب کو اس نوجوان کو دیکھ کر خوش ہوئے ہیں۔" میں سمجھا صبیحہ جھینپے گی مگر وہ بظاہر ذرا سی بھی تو نہیں جھینپی۔ صرف اتنا بولی۔ "میں اباجی کو بتا چکی ہوں۔ کہ ہمارے یہ پڑوسی صاحب بڑا دردمند دل رکھتے ہیں۔"

اب تو میں صبح و شام ذرا سی دستک دے کر پردہ اٹھاتا اور اندر چلا جاتا۔ میں قریشی صاحب کی دوا کے علاوہ ان کے گھر کا سودا بھی لانے لگا۔ ایک دن صبیحہ نے مجھ سے بال پنیں تک منگوائیں۔ البتہ بات چیت "تکلیف معاف اور" آپ نے بڑا احسان کیا ہے۔" سے آگے نہ بڑھی۔ صبیحہ مجھے دیکھتے ہی بہت فراخ دلی سے مسکراتی تھی اور مجھے کام پر روانہ کر دیتی تھی اور رات کو جب میں بستر پر لیٹتا تھا تو اس

کی ایک ایک حرکت کا بہت گہرا نفسیاتی تجزیہ کرتا تھا۔ سودے کے لئے رقم دیتے ہوئے اس کو پوریں میرے ہاتھ سے یوں ہی تو نہیں چھو گئی تھیں۔ پرسوں شام کو میرے سامنے دوپٹے کے بغیر یوں ہی تو نہیں آ گئی تھی۔ مجھے جو اس نے کہا تھا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں رل جاتی تو اتنی بامعنی بات اس نے یوں ہی تو نہیں کہہ دی تھی۔ نہیں۔ میں اسے رلنے نہیں دوں گا۔ ایسی ہیرا لڑکیاں رلنے کے لائق نہیں ہوتیں۔

ایک رات میں نے طے کیا کہ اب اظہار میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مجھ میں جرات کی کمی ہے۔ چنانچہ صبح کو سودا لا کر دینے کے بعد میں گھر آیا تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اظہار کی مشق کرتا رہا۔ پھر باہر گلی میں جانے کے لئے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو اس وقفے میں پہلی بار محسوس ہوا کہ صبیحہ کے دروازے پر دستک دینے کے لئے شیر کا کلیجہ چاہئے۔

اور ابھی میں اپنے مرجھائے ہوئے حوصلے کو تازہ دم کرنے کے مرحلے میں تھا کہ وہ میرے سامنے آ گئی۔ ''اویس صاحب! ذرا جلدی سے آ جائیے۔ پھر وہ فوراً ہی مشین کی طرح پلٹ گئی۔

میں باہر لپکا۔ پردہ اٹھا کر اندر گیا تو وہ دوسرے کمرے تھی۔ میں سیدھا وہاں پہنچا تو وہ اپنے ابا جی پر جھکی چمچے سے انہیں پانی پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو بولی ''ابا جی بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں نے گھبرا کر آپ کو بلا لیا۔ اب ٹھیک ہیں۔ پھر قریشی صاحب جھک کر پوچھا۔ ''ابا جی، اب آپ ٹھیک ہیں نا؟''

قریشی صاحب کے تیور اگرچہ منجمد تھے مگر ان کے چہرے کے کسی نہ کسی حصے سے اس جواب کا تاثر مل رہا تھا کہ۔۔۔ ٹھیک ہوں بیٹی۔

بڑی احتیاط سے گردن تک لحاف اوڑھا کر وہ بولی۔ ''چائے پئیں گے نا ابا جی۔'' پھر جیسے اس نے جواب سن لیا۔ بسور کر بولی۔ ''میں رونے بیٹھ جاؤں گی۔ یہیں آپ کے سینے سے لگ کر۔ یہ اویس صاحب بھی مجھے چپ نہیں کرا سکیں گے۔ ہاں۔۔۔ لاؤں چائے؟''

پھر وہ خوش ہو کر سیدھی ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔ ''ابا جی راضی ہو گئے ہیں۔''

کمرے سے باہر نکلی تو میں بھی ساتھ ہی چلا آیا۔ مجھے ایک مونڈھے پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا۔ ''چائے میں بناؤں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ کھڑی سوچتی رہ گئی۔ پھر مسکرائی اور بولی۔ ''آئیے مل کر بنائے لیتے ہیں۔''

میرے باورچی خانے کا سا باورچی خانہ تھا۔ چنانچہ ایک بار تو میں سمجھا وہ میرے گھر میں ہے اور میرے لئے چائے بنا رہی ہے۔ اظہار کے لئے مناسب ترین وقت تھا۔۔۔ مگر کیا یہ مناسب ترین وقت تھا؟''

کیتلی کو چولہے پر رکھ کر وہ بولی۔ ''آج آپ اتنے چپ کیوں ہیں اویس صاحب؟''

''چپ؟'' میں نے پوچھا۔ ''کون؟'' مگر میں ایسا باتونی کب تھا۔ صبیحہ صاحبہ۔''

ایک دم مجھے احساس ہوا کہ اگر میں ''صبیحہ'' کے ساتھ ''صاحبہ'' کا لاحقہ نہ لگاتا تو آدھا اظہار تو یوں ہی ہو جاتا۔

''میں نے کب کہا کہ آپ باتونی ہیں۔'' صبیحہ پیالیاں دھوتے ہوئے بولی۔ ''بس آپ مجھے کھوئے کھوئے سے لگے اس لئے پوچھ لیا اور اس لئے بھی پوچھ لیا کہ جو کھویا کھویا تو مجھے لگنا چاہیے۔''

یہ بھی اظہار کا ایک پہلو ہے۔ میں نے سوچا۔ اب لوہا گرم ہے۔ میں نے ضرب لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ ''بات یہ ہے صبیحہ۔۔۔'' ''صاحبہ'' کہنے سے پہلے میں نے حلق میں اٹکا ہوا کا گولا نکلنا چاہا، کہ ادھر سے قریشی صاحب کی بہت لمبی سی کھانسی کی آواز آئی اور صبیحہ گولی کی طرح باورچی خانے سے نکل گئی۔ میں نے اس دوران میں چائے تیار کرلی۔ دودھ گرم کرلیا۔ ایک پرانے گھسے ہوئے طشت میں سب چیزیں سجائیں تو وہ واپس آئی۔ ''ارے!'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''آپ تو لڑکیوں کی طرح سلیقہ مند ہیں۔''

لڑکیوں کی طرح!۔۔۔ میں نے ناگواری سے سوچا۔ پھر کہا۔ ''سلیقہ مندی پر صرف لڑکیوں کا اجارہ تو نہیں صبیحہ صاحبہ۔'' ناگواری کی وجہ میں صاحبہ کے لفظ کو روک نہ سکا۔

''میں نے آپ کی صنف پر تو حملہ نہیں کیا اویس صاحب۔'' وہ بولی۔ ''ویسے یہ تو آپ مانیں گے کہ سلیقہ مندی میں فوقیت لڑکی ہی کو حاصل ہے۔'' پھر طشت اٹھا کر بولی۔ ''آیئے۔ آپ ادھر کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں اباجی کو چائے پلا کر حاضر ہوتی ہوں۔ آیئے۔''

میں اس کے پیچھے اسی کمرے میں آیا جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور جس پر پرانا پلنگ پوش لٹک رہا تھا۔ مجھے ایک مونڈھے پر بٹھا کر اس نے چارپائی پر پڑی ہوئی ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ ''جب تک آپ یہ کتاب دیکھیے۔''

یہ ٹالسٹائی کی ''اینا کرنینا'' تھی میں نے اسے پڑھ رکھا تھا اس لئے پرلی طرف ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر پڑی ہوئی کتابوں کے پاس گیا۔ سب سے اوپر ایذرا پاؤنڈ کی نظموں کا مجموعہ رکھا تھا۔ اس کے نیچے پاسترنک کی روسی نظموں کے انگریزی تراجم کی کتاب تھی۔ پھر بیدی کا طویل افسانہ۔ ''اک چادر میلی سی۔'' نہ کوئی ڈائجسٹ، نہ کوئی نیوز ویک، نہ کوئی الٹسر ٹیڈ ویکلی! خاصی بقراط لڑکی معلوم ہوتی ہے!

''آج مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔'' وہ اسی مونڈھے پر آ کر بیٹھ گئی، جس پر مجھے بٹھا کر گئی تھی۔ پھر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میرے خیال میں آپ مونڈھے پر بیٹھیں۔ میں چارپائی پر بیٹھتی ہوں۔'' وہ چارپائی پر بیٹھ گئی، مگر پھر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ ''میں چائے تو وہیں چھوڑ آئی!''

جب تک وہ طشت لے کر واپس آئی۔ میں مونڈھے پر بیٹھ چکا تھا۔ بیٹھنے کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کھڑا ہوں۔ آج اسے مجھ ایک ضروری بات کہنی ہے نا۔۔۔ اور میں جانتا ہوں اس عمر میں ضروری بات کیا ہوتی ہے۔ مگر کیا یہ ضروری بات کہنے میں پہل مجھے نہیں کرنی چاہیئے۔۔۔ بہرحال دیکھتے ہیں۔۔۔ دیکھتے ہیں۔

اس نے چائے بنا کر پیالی میرے ہاتھ میں تھمائی اور بالکل میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ''اویس صاحب'' وہ بولی۔ اس کی آواز میں ایک ایسی کپکپی تھی جو چھپائی جا رہی تھی۔ مگر چھپ نہیں رہی تھی۔ ''اویس صاحب۔ میں نے آج ابھی ابھی اپنی زندگی کے بارے میں ایک فیصلہ کیا ہے۔''

مگر فیصلہ تو میں نے بھی کر رکھا ہے۔ میں نے سوچا۔

''اویس صاحب۔'' وہ چارپائی کو ذرا گھسیٹ کر میرے اور قریب آ گئی۔ ''میں دنیا کی شاید واحد لڑکی ہوں جس کی سہیلی ایک مرد ہے اور وہ آپ ہیں۔''

یہ جملہ کہہ کر صبیحہ مجھ پر سبقت لے گئی تھی۔ اس نے یہ پرانا مفروضہ غلط ثابت کر دیا تھا کہ عورت چاہے ہزار جان سے مرد پر فریفتہ ہو۔ محبت کا اظہار ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔

''اویس صاحب'' اب اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ''میں دو بھائیوں کی ایک ہی بہن ہوں مگر میرے یہ دونوں بھائی روپے کی تلاش میں ادھر ابوظہبی اور دوبئی کی طرف نکل گئے اور دولت کے نشے میں ایسے ڈوبے کہ اس گھر سے بھی ہمیشہ کے لئے نکل بھاگے۔ امی کا انتقال ہوا اور ابا جی نے انہیں اس حادثے کا تار بھجوایا تو دونوں کی طرف سے ایک ہی جوابی تار آیا جو صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا۔۔۔ ''سوری'' ۔۔۔ ''سوری'' آپ جانتے ہیں کہ ''افسوس ہے'' کی انگریزی ہے۔ ابا جی ہر روز اٹھ کر اور ہر روز سونے سے پہلے مجھ سے پوچھتے تھے کہ صابی، تمھارے بھائیوں کو کس پر افسوس ہے؟ اپنی اماں کی موت پر افسوس ہے یا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ افسوس ہم اتنے بڑے حادثے پر بھی اپنی دولت کی مشینیں روکنے سے اور پاکستان آنے سے قاصر ہیں۔ میرے دونوں بھائی مجھ سے بڑے ہیں۔ شروع میں خط لکھتے رہے۔ پھر وہیں شادیاں کر لیں اور خط بند کر دیئے۔ اب کسی آتے جاتے کے ہاتھ سلام دعا بھیج دیتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے مجھے انہوں نے ایک تسبیح بھیجی تھی جس سے بہتر تسبیح میں یہیں اپنے شہر کے بازار سے دو روپے کی خرید چکی ہوں۔ سو اویس صاحب، میں ان بھائیوں کی بہن ہوں اور یاد رکھئے، یہ میرے سگے بھائی ہیں مگر دولت تو سگوں کو بھی سوتیلا بنا دیتی ہے۔''

صبیحہ نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور بولی۔ ''معاف کیجئے گا۔ میں رونے والی لڑکی نہیں ہوں مگر کبھی کبھی آنسو زبردستی اپنے بہنے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اسے رونا کیوں آ رہا ہے اور جب تک وہ کسی نتیجے پر پہنچے، آنسو اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں۔ آپ بور تو نہیں ہو گئے؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ پریشان ہو گیا ہوں۔''

''میں بات کو مختصر کرتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''یہ باتیں میں آپ سے کر رہی ہوں مجھے اپنی امی سے کرنی چاہئے تھیں مگر وہ ہیں نہیں۔ ابا سے کرنی چاہئے تھیں مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، بھائیوں کا احوال آپ نے سن لیا۔ اسی لئے تو میں ایک پڑوسی جوان کو اپنی سہیلی کہا ہے کہ میں اس بھری دنیا میں آپ کے سوا کسی سے یہ بات کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا بھرم رکھیں گے اور مجھے شرمندہ نہیں کریں گے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں صبیحہ صاحبہ۔'' میں نے احتجاج کیا۔ میں اور آپ کا بھرم نہیں رکھوں گا! میں اور آپ کو شرمندہ کروں گا! میں جو آپ کے۔۔۔ جو آپ کے ایک۔۔۔'' پھر میں نے سوچا کہ اس صورت حال میں میری طرف سے اظہار مناسب نہیں ہوگا۔ پھر سہی۔ شام کو سہی۔

''میرے ابا بہت غریب آدمی تھے۔'' صبیحہ بولی۔ ''ننھی منیاری کی دوکان کرتے تھے۔ یہی سوئی، دھاگہ، بٹن، کنگھی، بال پنیں

وغیرہ بیچتے تھے۔ان کا ایک کھوکھا تھا۔شام کو گھر آتے تھے تو اپنا سارا اثاثہ گٹھڑی میں باندھ کر لے آتے تھے مگر آفرین ہے ان کی استقامت پر اور امی کی ہمت پر کہ پیسہ جمع کرتے رہے اور ہم تینوں کو پڑھاتے رہے۔بھائیوں میں سے ایک نے ایف۔اے کیا اور ایک نے میٹرک اور پھر چڑیا کے بچوں پر نکل آئے اور وہ دوسرے نگروں کو چل دیئے۔اس وقت میں آٹھویں میں تھی۔اب سارا لاڈ پیار، سارا پیسہ مجھ پر خرچ ہونے لگا مگر میں بگڑی نہیں۔میں نے میٹرک کیا۔پھر ایف۔اے کیا۔انہی دنوں امی چل بسیں۔اس کے بعد بی۔اے کیا اور ایم۔اے میں بھی داخلہ بھی لے لیا مگر پھر ابا جی پر فالج کے حملے ہونے لگے۔دو چار دن ان کا ایک بازو اور ٹانگ سن رہتے مگر پھر چلنے پھرنے لگتے۔تب میں کالج چلی جاتی مگر ایک آدھ دن کے بعد ان پر پھر حملہ ہو جاتا۔آمدنی رک گئی۔میرا کالج جانا بند ہو گیا اور اب کے تو ابا کی زبان ہی بند ہو گئی ہے۔آج ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ اب ان کا صحت یاب ہونا مشکل ہے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے منہ میں خاک، آج، کل پرسوں چل بسیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ تین چار سال تک زندہ رہیں مگر وہ اسی حالت میں زندہ رہیں گے۔۔۔۔مفلوج حالت میں۔''

صبیحہ نے شعوری طور پر آنسو پیئے اور پھر گلا صاف کر کے بولی۔''یہ سب پس منظر تھا۔اس بات کا جو مجھے آپ سے کہنی ہے۔اگر میں براہ راست کہہ دیتی تو آپ مجھے بے حیاء سمجھتے۔بات یہ ہے کہ ابھی محلے میں یہ بات زیادہ نہیں پھیلی ہے کہ کھوکھے میں منیاری کی دوکان کرنے والا قریشی مفلوج ہو چکا ہے۔جس روز سارے محلے کو یہ بات معلوم ہوگی، میں ایک ایسی لڑکی بن کر رہ جاؤں گی جو رات کے اندھیرے میں سڑک پر سے گزرتے ہوئے غنڈوں کے نرغے میں آ جاتی ہے۔میرے گھر میں پتھروں پر لپیٹے ہوئے محبت نامے گرنے لگیں گے۔میر گھر کر دروازے پر لوگ مجھ پر آوازے کسیں گے۔کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص اس گھر میں زندہ موجود ہے مگر میں اس گھر میں اکیلی رہ گئی ہوں۔اور ہمارا معاشرہ جو اپنے آپ کو بڑا مقدس کہتا ہے۔اکیلی، بے آسرا لڑکی پر یوں جھپٹتا ہے جیسے گدھ مردار پر جھپٹتے ہیں۔سو میں نے فیصلہ کیا اویس صاحب، کہ مجھے فوراً شادی کر لینی چاہیے۔

''درست فیصلہ ہے، بالکل درست فیصلہ۔''میں نے صبیحہ کی بھرپور تائید کی اور تائید کرتے ہوئے میری آواز اتنی بدل گئی خود میں نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

''خدا آپ کا بھلا کرے۔''صبیحہ نے اطمینان کی سانس لی۔''مجھے غلط مت سمجھئے گا۔''مجھے ایک نگران ہاتھ چاہیے۔میں لوٹ کا مال نہیں بننا چاہتی۔میرے بھائی مجھے اگر اس درندہ معاشرے کے آگے ڈال گئے ہیں تو اس کا مطلب نہیں کہ میں اس درندے کا شکار بن جاؤں۔میں اس درندے کے پھیلے ہوئے نوکیلے پنجوں کی زد سے باہر بھی تو جا سکتی ہوں۔میں شادی بھی تو کر سکتی ہوں۔''

یقیناً۔یقیناً، میں نے تائید مزید کی۔

''مجھے بس اتنی بات آپ سے کہنی تھی کہ کوئی اچھا سا رشتہ نظر میں رکھئے، اچھا سے میرا مطلب شریف آدمی سے ہے جو محبت کر سکتا ہو۔قربانی دے سکتا ہو۔لالچی نہ ہو، تنگ ظرف نہ ہو، دنیا کی خوبصورتیوں سے پیار کر سکتا ہو، دنیا کی بدصورتوں سے نفرت کر سکتا ہو اور اس نفرت کا اظہار کر سکتا ہو، مجھے کوئی دولت مند انسان نہیں چاہیئے صرف انسان چاہیئے جو غیر معمولی نہ ہو، عام سا ہو، جیسے میں ہوں۔۔۔جیسے

آپ ہیں۔"

اب اظہار مکمل ہو گیا تھا۔اب مجھے مزید تفصیل پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔میں مونڈھے پر بیٹھا ہوا کمرے میں تیرتا پھرتا تھا۔ایک بار جی چاہا بڑھ کر صبیحہ کو سینے سے لگا لوں اور اسے بتاؤں کہ تم نے میرے دل کہ بات کہہ دی اور کسی نے سچ کہا تھا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔دراصل میں نے طے کر لیا تھا کہ شام تک اس یہ بتانے آؤں گا کہ میں نے تمھارے لئے رشتہ ڈھونڈ لیا ہے۔لڑکا تمہارے معیاروں کے عین مطابق ہے اور لڑکے کا نام اویس ہے اور وہ تمھارے پڑوس میں رہتا ہے۔

ویسے مجھے صبیحہ کی ذہانت پر حیرت ہو رہی تھی کہ اظہار محبت کا یہ بالواسطہ طریقہ آج تک اور کسے سوجھا ہو گا۔

"ایک رشتہ میری نظر میں ہے۔" میں نے کہا۔"شام کو آپ کو بتا سکوں گا۔"

صبیحہ کھل اٹھی۔"یہ بڑا احسان ہو گا آپ کا۔"

"احسان کاہے کا صبیحہ"۔۔۔میں صبیحہ سے تعارف کے بعد پہلی بار اسے مخاطب کرتے ہوئے"صاحبہ" کا لاحقہ گول کر گیا تھا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔اب تو معاملہ صاف تھا۔

میں لٹکتے ہوئے پلنگ پوش تک پہنچا تو وہ بولی۔"اویس صاحب۔" سنئے میں رک گیا۔

"کہیے۔"

وہ میرے قریب آ گئی اور بولی۔"عمر کا خاص خیال رکھئے گا۔سکون اور صفائی سے زندگی گزارنے کے لئے زندگی کا تجربہ بہت ضروری ہے۔میں اکیس بائیس برس کی ہوں۔اسے کم از کم اکتیس بتیس برس کا ضرور ہونا چاہئے۔میری آپ کی عمر کے لڑکے عام طور پر بہت اتھلے ہوتے ہیں۔نا تجربہ کار،نمائشی سے،لونڈے سے،سمجھ گئے نا آپ؟"

میں نے دیوار کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں۔پھر سورج جیسے چھت کو توڑ کر میرے سر پر اتر آیا۔سارا منظر لہو لہو ہو رہا تھا اور وہ لہو کے اس سیلاب کو عبور کرتی کسی دوسرے کمرے میں تحلیل ہو گئی تھی۔

جوتا

کرموں ایک قوال پارٹی میں برسوں تک تالیاں بجا بجا کر تال دیتا رہا۔ پھر آواز لگانا بھی سیکھ گیا۔ پیچھے سے آگے آ گیا اور بڑے قوال کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھنے لگا۔ تب بڑے قوال کو تشویش لاحق ہوگئی کہ کہیں وہ اس سے بھی آگے نہ نکل جائے چنانچہ اس نے کرموں کو چلتا کر دیا۔ کرموں کی آواز تو واجبی سی تھی مگر اس نے قوالی کے گر سیکھ لیے تھے اور ہارمونیم کی آواز میں اپنی آواز چھپا لینے کی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے اپنی قوالی پارٹی بنا لی اور عرسوں، میلوں اور شادی بیاہ کے جمگھٹوں میں گاتا رہا اور اپنے تینوں بچوں کو پڑھاتا رہا۔ دراصل بڑے قوال کے ساتھ اسے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جانے کا موقع ملا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ اس نے اپنے بچوں کو تعلیم نہ دی تو وہ اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ڈھول شہنائی بجاتے یا قوالوں کے پیچھے بیٹھے تالیاں پیٹتے پھریں گے اور اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ان کی باچھیں ہمیشہ ڈھیلی رہیں گی۔

جب اس نے تینوں بچوں کو گاؤں کے سکول میں داخل کرایا تو سارا گاؤں جیسے سناٹے میں آ گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے، حضرت آدم کے آسمان سے زمین پر اترے سے لے کر اب تک کے زمانے کا یہ پہلا میراثی ہے جسے اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی سوجھی ہے۔ چوہدری نے اسے دارے پر بلایا اور ڈانٹا۔ ''شرم کرو کرمو، میراثی ہو کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو؟ کیا شادیوں میں ان سے لوگ ڈھول شہنائی کی بجائے کتابیں سنیں گے؟ کیوں بگاڑتے ہو انہیں؟ کیوں نام مارتے ہو اپنے نسلی پیشے کا؟''

کرموں یہ سب سنتا رہا اور چپ کا رہا۔ البتہ مسکراتا رہا۔ چوہدری کی اس ڈانٹ پر کہ اب کچھ بکو بھی، اس نے کچھ کہا تو بس اتنا کہ۔۔۔ ''اقبال قائم۔ عمر بھر دال ساگ کھانے والے کا بھی ایک آدھ بار مرغ بٹیر کا سالن چکھنے کو جی چاہتا ہی ہے۔''

کرموں نے قوالی کے نام پر چیخیں اور بڑھکیں مار مار کر پیسہ جمع کیا اور بچوں کو یوں پڑھایا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آتے تھے تو میراثی کی اولاد لگتے ہی نہیں تھے۔ پھر وہ نہ جانے کیا پٹی پڑھ کر آتے تھے کہ میراثی کے بیٹے ہونے سے شرماتے بھی نہیں تھے۔ کہتے تھے۔ ''ٹھیک ہے ہم کرمون میراثی کے بیٹے ہیں۔ مگر چوہدری کی طرح ہماری پیڑھی بھی تو حضرت آدم ہی سے ملتی ہے۔''

پھر یہ لڑکے ادھر لاہور، کالا شاہ کاکو اور فیصل آباد کی طرف ملوں میں ملازم ہوگئے اور باپ کر ہر مہینے اتنا پیسا روپیہ بھیجنے لگے کہ کرموں اپنی قوال پارٹی توڑ کر اپنے گھر میں رہنے لگا اور صاف ستھرے کپڑے پہننے لگا اور خیرات دینے لگا اور پھر ایک سال اس نے زکوٰۃ تک نکالی۔ چوہدری نے یہ سنا تو اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ حرام کی اولاد' اس نے کہا۔ ''اتھلا کمینہ کہیں کا۔ دیکھ لینا لوگو۔ سال دو سال میں خود زکوٰۃ مانگنے نکل کھڑا ہوگا۔ اگر اس وقت تک قیامت نہ آ گئی تو۔ ایک میراثی جب زکواۃ دینے لگے تو سمجھو سورج،

سوا نیزے پر اترنے کو ہے۔" اور چوہدری پھر یوں ہنسنے لگا جیسے رونے لگا ہے۔

کسی نے کرموں کو چوہدری کی یہ بات بتائی وہ بولا۔ "چوہدری کیوں خفا ہو رہا ہے۔ میں نے اسے تو زکوٰۃ نہیں بھجوائی۔ اسے بھی دیتا مگر ابھی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں بنتا اس کا۔ آہستہ آہستہ حقدار ہو جائے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔"

جن لوگوں نے کرموں کو چوہدری کی بات بتائی تھی انہوں نے چوہدری کو کرموں کی بات بتانا بھی ضروری سمجھا۔ اس وقت چوہدری شربت پی رہا تھا۔ یہ بات سنی تو اسے اچھو ہو گیا اور شربت اس کی ناک سے بہنے لگا۔

پھر ایک روز کرموں گلی میں بیٹھا لوگوں سے گپ ہانک رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ "میں میراثی ہوں پر تین بابو لوگوں کا باپ بھی ہوں اس لئے جی چاہتا ہے، یہاں گلی میں بیٹھنے کی بجائے ایک پکی بیٹھک بنوالوں۔ اس میں پلنگ اور مونڈھے بچھا دوں اور تم سب کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہاں کی اچھی اچھی، پیاری پیاری، میٹھی میٹھی باتیں کروں۔ بیٹھنے کے لئے چوہدری کا دارا تو ہے مگر میں وہاں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے سر کے بل کھڑا ہوں۔"

یہ بات کر کے وہ اپنے گھر گیا۔ حقہ تازہ کیا۔ چلم پر آگ سجائی اور کش لگانے کے لئے چارپائی پر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چوہدری کی طرف سے اسے بلاوا آ گیا۔ اس نے دارے پر قدم رکھا ہی تھا کہ تین چار مسٹنڈوں نے اسے دبوچ کر گرا دیا اور چوہدری کا پلا ہوا منشی اس کی پیٹھ پر جوتے برسانے لگا۔ ساتھ ساتھ چوہدری اسے گالیاں دیتا رہا اور کہتا رہا۔ "بیٹھک بنائے گا کمینہ؟ دارا لگائے گا میری طرح، چار پیسے کیا آ گئے ہیں اپنی اوقات ہی بھول گیا رذیل۔ لگاؤ۔ اور لگاؤ۔

کرموں کو اتنے جوتے لگے کہ کسی اور کو لگتے تو وہ گنتی بھول جاتا مگر کرموں گنتا رہا۔۔۔۔ "میں تو گنتا رہا" اس نے اپنے ملنے والوں کو بتایا۔ میں تو گنتا رہا تا کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے جوتوں کا حساب چکانے میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ باسٹھ لگے تھے۔ باسٹھ پورے کروں گا خدا کے حضور انشاء اللہ۔ ایک کے ستر نہ سہی۔ چوہدری کے لئے تو میرا ایک ہی جوتا بہت ہے۔ سارے جہاں کی مخلوق سے سامنے۔

انہی دنوں ووٹ درج ہو رہے تھے۔ ووٹ درج کرنے والے اس گاؤں میں بھی آئے اور کرموں کا ووٹ بھی درج کرنے لگے۔ تب ان میں ایک بولا۔ "بھئی تم اپنا نام کرما بتاتے ہو مگر کرما کیا نام ہوا؟ کرم الٰہی ہو گا یا کرم دین۔ کرما کوئی نام نہیں ہوتا۔ یہ تمھارے اصلی نام کا بگاڑ معلوم ہوتا ہے۔"

کرموں بولا۔ "میں میراثی ہوں جی اور میراثیوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میرے نام کا بگاڑ تو کرموں ہے۔ جیسے میرے باپ کو لوگ گاموں کہتے تھے پر اس کا اصلی نام گاما تھا۔"

زچ ہو کر انہوں نے فہرست میں۔ "کرما ولد گاما دات میراثی گداگری" کے الفاظ لکھے تو کرموں بگڑ گیا۔ "نہیں صاحب جی۔ میں گداگر نہیں ہوں۔ گدا کا ایک پیسہ بھی مجھ پر حرام ہے۔ میں تو عمر بھر اپنی محنت کی کمائی کھاتا رہا۔ میرے بچے پڑھ لکھ گئے تو یہ بھی میری محنت کی کمائی ہے۔ اب وہ محنت کرتے ہیں اور میری محنت کا بدلہ چکاتے ہیں۔ میں تو اب زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ پھر میں گداگر کیسے ہو

گیا۔ گداگری اتنی سستی ہے تو چوہدری کو گداگر لکھو کہ کسان محنت کرتا ہے اور چوہدری کھاتا ہے۔"

چوہدری کو خبر ملی کہ کرموں نے ووٹ درج کرنے والوں کے سامنے اس گداگر کہا ہے۔ اسے فوراً دارے پر بلایا گیا اور سب گاؤں کے سامنے چوہدری نے اپنے منشی سے اسے جوتے لگوائے۔ جوتے لگ رہے تھے جب کرموں اچانک اٹھ بیٹھا اور منشی کی کلائی جکڑ کر بولا۔ "بس باسٹھ پورے ہو گئے۔ میرا کوٹہ مجھے مل گیا۔ زیادہ لگاؤ گے تو قیامت کے دن چوہدری جی کو زیادہ تکلیف ہوگی۔"

"مجھے تکلیف ہوگی۔" چوہدری حیران رہ گیا جیسے اس کے سر پر سورج گر پڑا ہے۔ "مجھے کیسے تکلیف ہوگی کمینے؟"

کرموں کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ بولا۔ چلئے آپ کو تکلیف نہیں ہوگی تو آپ کا حساب پورا کرنے والے فرشتے کو تکلیف ہوگی۔"

"میرا حساب؟" چوہدری نے اس طرح پہلو بدلا جیسے پلنگ پر ہی کھڑا ہو جائے گا۔

"کیا بکتے ہو؟ میرا حساب کیسا؟"

"جی یہی، غریبوں کو جوتے لگوانے کا حساب۔ ایک کے ستر۔ کرموں مزید جوتوں کا انتظار کئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور زمین پر سے اپنی پگڑی اٹھا کر اسے جھاڑ رہا تھا۔ "اب آپ خود حساب لگا لیجئے۔ اقبال قائم، کہ باسٹھ یہ جوتے اور باسٹھ وہ پچھلے۔ کل ہوئے خدا آپ کا بھلا کرے۔ ایک سو چوبیں۔ قیامت کے دن اگر ایک سے ستر لگیں گے تو ایک سو چوبیں کے کتنے لگیں گے۔ منشی جی، حساب لگا کر چوہدری جی کو۔"

چوہدری نے غصے میں اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر جب کہ دارے پر موجود بیشتر لوگ کرموں کی باتوں پر دانت نکالے کھڑے ہیں تو ہاتھ واپس لانے کی بجائے اس نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھایا اور اسے اپنی پوروں میں یوں مسلا کہ وہ سفوف بن کر رہ گیا۔ گالیاں اس کے ہونٹوں پر کپکپاتی رہ گئیں۔

اس وقت پرندے واپس آشیانوں کو جا رہے تھے۔ شام قریب تھی۔

چوہدری سے واقعے کے بعد کرموں سے بہت سنبھل کر بات کرنے لگا۔ کرموں میراثی تو تھا مگر کھاتا پیتا میراثی تھا اور کھاتے پیتے لوگ، کھاتے پیتے لوگوں سے بات ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ جیسے امریکہ روس سے اور روس امریکہ سے بات کرتا ہے۔ تاہم جب چوہدری کے دارے پر سے فالتو لوگ اٹھ جاتے اور صرف اس کے قریبی لوگ باقی رہ جاتے تو وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا۔ "اب یہ کمینہ کڑوی گولی تھوک دیتا ہے۔ اب میں اسے شکر چڑھی گولیاں کھلاؤں گا۔" پھر وہ حالات کے طویل تجزیئے میں مصروف ہو جاتا۔ "لوگ کہتے ہیں شراب کا نشہ برا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں نو دولتیوں کے لئے روپے کا نشہ اس سے بھی برا ہے۔ کرموں کو دیکھو۔ کہاں تو جب بھی مجھے یہ میراثی زادہ ملتا تھا۔ اقبال قائم، اقبال قائم کی رٹ لگاتا ہوا رکوع میں چلا جاتا تھا اور کہاں یہ دن کہ کل کہنے لگا۔۔۔ میں ادھر لاہور فیصل آباد کی طرف جا رہا ہوں۔ کوئی چیز چاہیئے تو لیتا آؤں۔ کوئی چھتری وڑی، کوئی جوتا ووتا! یہ سب روپے کا نشہ ہے۔" پھر چوہدری نے گردن کو کھینچنے کی حد تک کھینچ کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔ "کہیں وہ کسی کونے کھدرے میں بیٹھا تو نہیں حرام کی اولاد۔ یاد ہے کہ ایک بار میں

یہیں دارے پر اسی باتیں کر رہا تھا اور اندھیرے میں مجھے پتہ نہ چلا تھا کہ وہ کمینہ بھی ایک طرف بیٹھا ہے؟ میں نے اس نسلی کنگلے کے نئے ٹھاٹھ کی بات کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کوا اگر مور کے پر سجالے تو بھی کوا ہی رہتا ہے۔اس پر وہ میری چلمیں بھرنے والا۔۔۔میرے اصطبل صاف کرنے والا۔۔۔بھرے دارے میں بولا۔ویسے چوہدری جی۔سیانوں سے سنا ہے کہ مور بھی کوے ہی کی نسل میں سے ہے۔صرف رنگ دار پر نکال لئے اور ناچنا سیکھ گیا ہے!"۔۔۔یاد ہے نا؟ روپے نے اتنے حوصلے بڑھا دیئے ہیں اس افلاطون کے پٹھے کے، ورنہ یہاں میرے سامنے بلی کی طرح منمناتا پھرتا تھا۔روپے نے اس کی زبان کھینچ کر میرے جوتے بھر کی کر دی ہے۔مگر مجھے بھی ایسے نو دولتیوں کو آپے میں رکھنے کا گر معلوم ہیں۔جوتے پر چاہے سنہرا کام ہوا ہو رہے گا تو وہ جوتا۔اور پاؤں میں ہی پہنا جائے گا۔اس میراثی کے بچے کو میرے گاؤں میں رہنا ہے تو میراثی بن کر رہنا ہو گا۔دیکھ لینا۔"

سردیوں کے دن تھے۔کرموں چند روز اپنے بیٹوں کے ہاں گزار کر واپس آیا تو اس نے سنہرے رنگ کا ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا۔لوگ اس کمبل کو چھوتے تو حیران رہ جاتے کہ کیا کسی بھیڑ کی اون اتنی نرم بھی ہو سکتی ہے! کرموں کے ایک رشتہ دار نے اس کمبل کر چھوا تو بسم اللہ پڑھ کر کمبل کا کونہ منہ میں ڈال لیا اور بولا۔سوجی کا حلوہ ہو تو ایسا کہ جب جی چاہا اوڑھ لیا جب جی چاہا کھا لیا۔

خود کرموں ملنے والوں کو بتاتا رہا کہ پورے ایک سو کا ہے۔"اور پھر صرف خوب صورت ہی نہیں ہے اندر سے بھی بڑا گنی ہے۔باہر برف گر رہی ہو تو کمبل میں انگیٹھی سی دہکتی رہتی ہے۔پوہ کی ٹھنڈ میں بھی پسینہ آنے لگتا ہے۔پنجتن پاک کی قسم!"

پوری بستی میں اس کمبل کے چرچے ہونے لگے۔بات چوہدری تک بھی پہنچی مگر یوں کہ کرموں کہہ رہا تھا۔۔۔ایسا کمبل تو چوہدری کو بھی نصیب نہیں ہوا ہو گا۔"۔۔۔اس پر چوہدری یوں مسکرایا جیسے کسی نے خربوزے کا ایک سرا چھری سے چیر دیا ہے۔کرموں کے روپے نے چوہدری کو سیاستدان بنا دیا تھا۔

ایک دن کرموں یہ کمبل اوڑھ کر چوہدری کے دارے کی گلی میں سے گزرا تو چوہدری اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔کرموں کو بلایا اس کے کمبل پر ہاتھ پھیر کر بولا۔"کہاں سے مارا؟"

کرموں پاس ہی ایک سل پر بیٹھ گیا۔"میں نے تو۔۔۔اقبال قائم۔۔۔ساری عمر میں ایک پدا تک نہیں مارا کمبل کہاں سے ماروں گا۔اور پھر کمبل بھی ایسا کہ آپ نے بھی چھوا تو میں نے آپ کے رونگٹے کھڑے ہوتے دیکھے۔"

چوہدری کا چہرہ کچھ تن گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔خربوزے میں ایک اور چیر پڑا اور چوہدری بولا۔"چلو مارا نہیں تو لیا کہاں سے؟"

کرموں نے جواب میں لحہ بھر دیر کی۔اس کی آنکھیں چمکیں۔اپنے بیٹوں کے ذکر پر ہمیشہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی پتلیوں میں رکھے ہوئے چراغوں کی لویں جل اٹھی ہیں۔

"کالا شاہ کاکو میں میرا بیٹا ہے نا سرفراز۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔وہ سرفا!" چوہدری نے کرموں کی تصحیح کی۔

''جی ہاں۔۔وہی سرفراز۔'' کرموں نے اپنی غلطی کی تصحیح کو کوئی اہمیت نہ دی۔''وہ کہنے لگا بابا۔اب کے یہاں سے ایک اچھا سا جوتا لے جاؤ۔میں نے کہا، بیٹے جوتے تو ادھر گاؤں میں بہت ہیں۔کچھ اور دلا دو۔کوئی تحفہ چیز۔وہ یہ کمبل لے آیا۔ملیشیا میں اس کے کسی دوست کا ابا رہتا ہے۔وہ یہ کمبل اپنے بیٹے کے لئے لایا۔سرفراز نے اس سے اپنے ابا کے لئے خرید لیا۔''

چوہدری بولا۔''دیکھو کرموں۔اگر میں کہوں کہ مجھے یہ کمبل چاہیئے۔۔۔تو؟''

''تو لے لیجئے نا اقبال قائم۔'' کرموں نے گرج کر جواب دیا۔''سرفراز پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ چور لے گئے۔''

چوہدری نے کرموں کی بات زور کے ایک قہقہے میں اڑانے کی کوشش کی مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس قہقہے کا پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

''اس کے کیا لو گے؟''

''کچھ بھی نہیں اقبال قائم۔'' کرموں کی آواز میں بڑی آسودگی اور بے نیازی تھی۔

''مگر میں مفت نہیں لوں گا۔'' چوہدری بولا۔''یہ ہماری خاندانی عادت ہے کہ ہم مفت چیزیں دیتے ہیں، لیتے نہیں ہیں۔تم تو جانتے ہو۔تمھیں تو عمر بھر کا تجربہ ہے۔''

''جی ہاں'' کرموں نے کہا۔''پر کبھی کبھی لینے والوں پر دینے کا وقت بھی آ جاتا ہے اقبال قائم۔لے لیجئے نا۔سرفراز مجھے اور بھیج دے گا۔''

نہیں کرموں۔'' چوہدری بولا۔''تم ہمارے میراثی ہو۔تمھارے باپ دادا نے ہمارے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔مانگو کیا مانگتے ہو اس کمبل کا۔سرفے نے تمھیں بتایا تو ہوگا کہ اس کمبل کے کتنے روپے دیئے تھے۔

''جی ہاں سرفراز نے بتایا تو تھا۔'' کرموں کی آواز میں منصوبہ سازی کی گہرائی تھی۔

پھر وہ جیسے ایک نتیجے پر پہنچ کر مسکرانے لگا اور بولا۔''کمبل دوسرے ملک کا ہے نا جی۔میں نے کہا بھی سرفراز سے اتنی فضول خرچیاں مت کیا کرو۔بولا۔کوئی بھی چیز ہمارے ابا کے آرام سے مہنگی نہیں ہے۔آپ ٹھیک کہتے تھے۔تعلیم نے لڑکوں کے دماغ بگاڑ دیئے ہیں۔اقبال قائم۔۔۔قیمت کچھ زیادہ ہی ہے۔''

''یعنی اتنی زیادہ کہ سرفا میراثی یہ قیمت ادا کر سکتا ہے اور میں نہیں کر سکتا؟''

چوہدری نے اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کے باوجود پوری طرح نہ چھپا سکا۔''بتاؤ کتنے میں آیا ہے۔پچاس، سو، دو سو، تین سو، کتنے ہیں؟''

''تین سو تو خیر نہیں جی۔'' کرموں نے چوہدری کے منشی کی طرف یوں دیکھا جیسے جوتے لگانے سے پہلے منشی نے کرموں کو دیکھا تھا۔کل دو سو باسٹھ میں آیا ہے۔'' اس نے حاضرین پر داد طلب نظریں ڈالیں۔

''اور اتنی رقم تمہارے بیٹے نے ادا کر دی؟''

''کماتا کجا تا ہے نا اقبال قائم۔''

''تو تم مجھ سے دوسو باسٹھ روپے لو گے؟''

''آپ باسٹھ رہنے دیجئے۔ ان کا حساب پھر ہوتا رہے گا۔ دوسرے دے دیجئے۔''

''دوسو باسٹھ میں باسٹھ ملا کر کیوں نہ دوں؟ چوہدری نے فاتحانہ انداز سے کہا۔

''آخر تم ہمارے میراثی ہو۔''

''چلئے زیادہ دے دیجئے اقبال قائم ۔۔۔تین سو چوبیس دے دیجئے۔''

''تمھیں تو دکانداروں کی طرح ٹھیک ٹھیک حساب کرنا بھی آ گیا!'' چوہدری نے دل لگی کرنے کی کوشش کی۔

اور کرموں کمبل اتارتے ہوئے بولا۔''میں تو اب بے حساب خرچ کرتا ہوں اقبال قائم۔ بس کچھ آتا ہے تو یہ باسٹھ کو حساب آتا ہے۔''

چوہدری نے کرموں کے چلائے ہوئے چابک سے بے نیاز کر اپنے منشی سے کہا۔''لو بھئی دے دوا سے تین سو چوبیس۔''

''روپے منشی جی۔ تین سو چوبیس روپے۔'' روپے کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کرموں نے منشی کو تاکید کی۔

''روپے نہیں تو پیسے؟'' منشی نے قمیص کے نیچے پہنی ہوئی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے نوٹوں کا ایک گٹھا نکالتے ہوئے پوچھا۔

''میرا مطلب تھا کہیں آپ تین سو چوبیس روپے کی بجائے تین سو چوبیس جوتے لگانے نہ بیٹھ جائیں۔''۔۔۔

چوہدری سمیت سب لوگ زور سے ہنسے مگر سب کی ہنسی کا مفہوم الگ الگ پہچانا جاسکتا تھا۔ چوہدری نے یوں تو ہنسا جیسے اس کا سینہ ٹین کی ایک چادر ہے۔ جس پر کنکروں سے چاند ماری ہے۔

کرموں نے روپے لئے اور مسکراتا ہو چلا گیا۔

تب چوہدری اپنے سامنے کمبل پھیلوا کر مسکرایا۔ اس خوب اچھی طرح جھڑوایا جیسے کمبل میراثی پنا نکال رہا ہے۔ اسے تہہ کرا کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو۔'' کہنا اسے دن بھر دھوپ دکھائیں اور پھر کسی پیٹی میں پھینک دیں۔''

پھر وہ حاضرین سے مخاطب ہوا۔''درجنوں کمبل پڑے ہیں اس طرح کے کمبل۔ مگر میں دو پیسے کے میراثی کو ڈھائی تین سو روپے کا کمبل اوڑھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جوتے کو پاؤں میں رہنا چاہیئے۔

(۱۹۷۹ء)

عالاں

اماں ابھی دہی بلور ہی تھیں کہ وہ مٹی کا پیالہ لئے آنکلی۔ یہ دیکھ کر کہ ابھی مکھن ہی نہیں نکالا گیا تو لسی کہاں ملے گی۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ واپس چلی جائے یا وہیں کھڑی رہے۔

بیٹھ جاؤ عالاں۔ اماں نے کہا۔ ابھی دیتی ہوں۔۔ کیسی ہو؟"

"جی اچھی ہوں۔" وہ وہیں بیٹھ گئی جہاں کھڑی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اماں بولیں۔" اب میں مکھن نکالنے لگی ہوں۔ برا نہ منانا۔ نیت بری نہ بھی ہو تو نظر لگ جاتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں نوراں نے مجھے مکھن کا پیڑا نکالتے دیکھا تو دوسرے دن مرغی کے انڈے کے برابر مکھن نکالا۔ اور اس سے اگلے دن چڑیا کے انڈے کے برابر۔ گائے کو تین دن مرچوں کی دھونی دی تو نظر اتری۔"

عالاں ٹنکی۔" نظر تو کبھی کبھی میری بھی لگتی ہے بی بی جی۔ اس سے پہلے کہ آپ کا شیشے کا ایک گلاس توڑ چکی ہوں۔"

"ہاں ہاں۔" اماں کو یاد آ گیا۔" تم نے کہا۔ ہائے بی بی جی۔ کیسا صاف شفاف ہے کہ نظر آر پار جاتی ہے۔ اور پھر یوں ہی پڑے پڑے ٹھیں سے ٹوٹ گیا۔ میں تو حیران رہ گئی۔" پھر انہوں نے عالاں کو ڈانٹا مگر اس ڈانٹ میں غصہ نہیں تھا۔" لو اب ادھر پرلی طرف دیکھو۔"

اور وہ مسکراتی ہوئی ایک طرف گھوم گئی اور سامنے دیکھنے لگی۔ سامنے میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوپٹے کا پلو آدھے سر پر سے کھینچ کر ماتھے تک لے آئی اور بولی۔" بی بی جی، اندر چھوٹے میاں جی تو نہیں بیٹھے؟"

"اری عارف ہی تو ہے۔" اماں بولیں۔" رات آیا ہے۔"

عالاں اٹھ کر دروازے تک آئی اور بولی۔" رد بلائیں، دور بلائیں۔"

"کیسی ہو عالاں؟" میں نے پوچھا۔

"جی اچھی ہوں۔" وہ بولی۔ پھر اس کے چہرے پر شرارت چمکی۔" پہلے تو میں آپ کو پہچانی ہی نہیں۔ میں سمجھی کوئی بچہ مونچھیں لگائے بیٹھا ہے۔"

اس پر اماں کی ہنسی چھوٹ گئی۔۔۔۔" توبہ ہے۔" وہ بولیں۔" کم بخت ایسی بات کرتی ہے کہ۔۔۔۔ توبہ ہے۔"

عالاں دہلیز پر یوں بیٹھ گئی کہ اس کا ایک پاؤں باہر صحن میں تھا اور ایک کمرے کے اندر نشت کے اس انداز سے اس کی نیلی تہبند

کوتان کر اس کی آدھی پنڈلیوں تک اٹھا دیا تھا۔اس کے میلے پاؤں کے مقابلے میں اس کی پنڈلیوں کا رنگ مختلف تھا اور پنڈلیاں کتنی سڈول تھیں! یونانیوں نے وینس کے بت کی جو پنڈلیاں بنائی تھیں وہ کیا عالاں کی پنڈلیاں دیکھ کر بنائی تھیں۔

''عارف میاں، پردیس میں آپ کیا کرتے ہیں؟''اس نے مجھ سے یوں پوچھا جیسے چوپال میں بیٹھی گپ لڑا رہی ہے۔ساتھ ہی وہ المونیم کے پیالے کو فرش پر ایک انگلی سے مسلسل گمائے جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔''نوکری کرتا ہوں۔روپیہ کماتا ہوں۔''

''بی بی جی کو کتنا بھیجتے ہیں؟''اس نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

''اے لڑکی!''اماں نے اسے ڈانٹا۔''اپنی عمر کے لڑکوں سے یوں باتیں نہیں کرتے۔اب تو چھوٹی نہیں ہے۔کیا ابھی تک تجھے کسی نے بتایا کہ تو بڑی ہو گئی ہے۔''

وہ دہلیز پر بیٹھی تھی اماں کی طرف گھوم گئی۔اب اس کے دونوں پاؤں صحن میں تھے اور بالوں کا ڈھیر کمرے میں تھا۔''کون بتائے گا بی بی جی؟''وہ بولی۔''اماں ابا ہوتے تو بتاتے۔انہیں تو خدا کے پاس جانے کی اتنی جلدی پڑی تھی کہ میرے سر پر سے اپنا ہاتھ اٹھایا تو یہ انتظار بھی نہیں کیا کہ کوئی اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھے تو چلیں۔''عالاں کی آواز آنسوؤں نے بھگو دیا تھا۔

میں نے کہا۔''عالاں تمھاری اماں تو کب کی چل بسی۔کیا باپ بھی چل دیا؟''

اب کے گھوم کر اس نے دونوں پاؤں کمرے میں رکھ دیئے اور بولی۔''جی۔وہ بھی چلا گیا۔میں لڑکا ہوتی تو شاید مجھے جوتا گانٹھنا سکھا جاتا پر وہ مجھ سے روٹیاں ہی پکواتا رہا اور پانی بھرواتا رہا۔اب میں ایک موچی کی بیٹی ہوں پر اپنے جوتے دوسروں سے مرمت کراتی ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟''اماں بولیں۔''تجھے صرف جوتے گانٹھنا نہیں آتے نا۔باقی تو سب کام آتے ہیں۔اپنی محنت سے کماتی اور کھاتی ہو۔سارا گاؤں تمھاری تعریف کرتا ہے۔لوسی لے لو۔''

عالاں جو اماں کی گفتگو کے دوران انہی کی طرف گھوم گئی تھی۔اٹھی اور جا کر پیالہ اماں کے پاس رکھ دیا۔

وہ لسی کا پیالہ لے کر جانے لگی مگر چند قدموں کے بعد ایک دم رک گئی اور پلٹ کر بولی۔''آج بھی چکی پیسنے آجاؤں بی بی جی؟''

''آجانا، آجانا۔''اماں بولیں۔''آٹا تو ڈھیروں پڑا ہے پر عارف کے ابا کی برسی بھی تو زیادہ دور نہیں ہے۔کئی بوریوں کی ضرورت پڑے گی۔آجانا۔''

''جی اچھا۔''وہ بولی۔پھر وہیں کھڑے کھڑے مجھ سے پوچھا۔عارف میاں آپ کتنی چھٹی پر آئے ہیں؟''

میں نے کہا:''میں ابا کی برسی کر کے جاؤں گا۔''

بولی۔''پھر تو بہت دن ہیں۔''

جب میں گاؤں میں ادھر ادھر گھوم کر واپس آیا تو وہ اندر ایک کوٹھریا میں بیٹھی چکی پیس رہی تھی۔ اوڑھنی اس کے سر سے اتر گئی تھی اور کھلے بال چکی کے ہر چکر کے ساتھ اس کے چہرے کے چھپا اور کھول رہے تھے۔ اس نے ایک ٹانگ کو پورا پھیلا رکھا تھا اور نیلا تہبند اس کے گھٹنوں تک کھینچ گیا تھا۔ اگر ایسی پنڈلی کو کاٹ کر اور شیشے کے مرتبان میں رکھ کر ڈرائینگ روم میں سجا دیا جائے تو کیسا رہے!''

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اماں کہیں نظر نہ آئیں تو میں پنجوں کے بل کوٹھریا کے دروازے تک گیا۔

دور سے آتی ہوئی روشنی ایک دم کم ہوئی تو اس نے چونک کر دیکھا۔ چکی روک لی۔ بالوں کو جھٹک کر سمیٹا اور اوڑھنی کر سر پر کھینچ لیا مگر پھیلی ہوئی ٹانگ کر پھیلا رہنے دیا۔ پھر وہ چکی کی ہتھی کو تھام کر آہستہ آہستہ گھمانے لگی اور میری طرف دیکھتی چلی گئی۔

اس وقت میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ ایک موچی کی بیٹی کی آنکھوں کو اتنا بڑا نہیں ہونا چاہیئے۔ غریب غرباء کو چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہی کفایت کر جاتی ہیں۔''

اس کے چہرے پر شرارت تھی اور اس کے ڈر کے مارے کہ وہ کوئی فقرہ نہ مار دے میں نے پوچھا۔ ''اماں کہاں ہیں؟''

وہ بولی۔ ''تو کیا آپ بی بی جی کو دیکھنے یہاں تک آئے ہیں؟''

''تو کیا تمھیں دیکھنے آیا تھا؟'' مجھے حملے کا موقع مل گیا۔

اس نے بس اتنا کیا کہ ٹانگ سمیٹی اور پھر پھیلا دی۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میں نے پھر پوچھا۔

''اماں کہاں ہیں؟''

''یہیں حویلی میں ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کی چچا کی بیٹی بیمار ہیں۔ انہیں دیکھنے گئی ہیں۔

میں نے کہا۔ ''یہ جو تم پیسائی کر رہی ہو اس کی کتنی اجرت لو گی؟''

''دہ دن کا آٹا تو مل ہی جائے گا۔'' اس کے لہجے میں کاٹ سی تھی۔ نہ جانے طنز کر رہی تھی یا اس کا لہجہ ہی ایسا تھا۔

''اچھا دو دن گزر گئے تو پھر کیا کرو گی؟''

''پھر آ جاؤں گی آٹا پیسنے یا پانی بھرنے یا چھتیں لیپنے؟''

''چھتیں لیپنے؟ کیا تمھیں لیپنا بھی آتا ہے؟'' میں نے سچ مچ حیرت سے پوچھا۔

اور وہ بولی۔ ''مجھے کیا نہیں آتا عارف میاں۔ بس ایک جوتے گانٹھنے نہیں آتے۔ اور بہت کچھ آتا ہے۔''

''مثلاً اور کیا کیا آتا ہے؟'' میں نے شرارت سے پوچھا۔

''اور۔۔۔؟ اور۔۔۔'' وہ کچھ بتانے لگی تھی مگر جیسے سوچ میں پڑ گئی اور آخر بولی۔

''کچھ آتا ہے آپ دیکھ لیں گے ہولے ہولے۔''

چند لمحے وہ چکی چلانے میں مصروف رہی جیسے مجھے بھول گئی ہے۔ پھر چکی روکی۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ میں ایک طرف ہٹا تو وہ باہر آ گئی اور بولی۔ ''پیاس لگی ہے پر بی بی جی کا کٹورا جھوٹا ہو جائے گا۔ مجھے بک میں پلا دیجیئے۔''

''تم کٹورے ہی میں پی لو۔'' میں نے کہا اور پھر ڈانٹ کے لہجے میں کہا۔ ''چلو اٹھا کٹورا۔ پیو پانی۔''

اس کی مسکراہٹ کتنی گلابی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انکشاف ہوا کہ مسکراہٹ کا بھی رنگ ہوتا ہے۔

وہ پانی پی چکی تو کٹورے کو کھنگالنے کے لئے اس میں ذرا سا پانی ڈالا۔ میں نے کہا۔ ''بھر دو کٹورا۔'' وہ سمجھی شاید میں کٹورے کو پوری طرح پاک کرانا چاہتا ہوں۔ کٹورا بھر گیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے کٹورا اس کے ہاتھ سے اچک کر منہ سے لگا لیا۔

''عارف میاں جی۔'' وہ انتہائی حیرت اور صدمے سے بولی۔ وہ حواس باختہ سی میری طرف دیکھتی رہی۔ اور جب میں نے خالی کٹورا واپس کیا تو اس کے ہاتھ میں رعشہ تھا اور اس کی آنکھوں پر نمی کی ایک چمکیلی تہہ نمودار ہو گئی تھی اور اس نے اوڑھنی کو یوں کس کے لپیٹ لیا تھا جیسے نماز پڑھنے چلی ہے۔

گاؤں میں جوان لڑکی کا ایک ایک قدم گنا جاتا ہے۔ ایک ایک نظر کا حساب رکھا جاتا ہے۔ بہت سے دوست بیٹھے تھے۔ لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ فلاں فلاں کے ساتھ ہے۔ فلاں فلاں کے پیچھے ہے۔ فلاں اغوا ہونے کے انتظار میں ہے۔ فلاں اتنے ہاتھوں سے گزری ہے کہ اس بھری جوانی میں بھی پرانی ہو گئی ہے۔

میں نے کہا۔ ''ایک لڑکی عالاں بھی تو ہے، نادرے موچی کی بیٹی؟''

اس پر سب ہنسنے لگے وہ؟ انہوں نے کہا۔ ''وہ کسی کام کی نہیں ہے۔ گھر گھر میں کام کرتی پھر رہی ہے۔ روپیہ کما رہی ہے۔ خوبصورت ہے پر نکمی ہے۔ ایک بار بیگو موچھیل نے چھیڑا تو بولی۔ ''میں موچی کی بیٹی ہوں۔ کھال اتار لیتی ہوں!'' بیگو کو اتنی شرم آئی کہ سیدھا نائی کے پاس گیا اور مونچھوں کی نوکیں کٹوا دیں!'' سب ہنسنے لگے اور دیر تک ہنستے رہے۔

میں نے کہا۔ ''اگر وہ محنتی لڑکی ہے تو اس کی عزت کرنی چاہئے۔

ایک بولا۔ ''وہ عزت بھی تو نہیں کرنے دیتی!''

اس پر سب کو ایک بار پھر ہنسی کا دورا پڑا۔

دوسرا بولا۔ ''تمھارے ہاں تو بہت کام کاج کرتی ہے۔ کبھی اس کی عزت کر کے دیکھو۔ کھال اتار لے گی!''

وہ پھر ہنسنے لگے اور مجھے ان کی ہنسی میں شریک ہونا پڑا مگر مجھ سے اپنی ہنسی کی آواز پہچانی ہی نہیں گئی۔ بالکل ٹین کے خالی کنستر مین کنکر بجنے کی آواز!

میں گھر واپس آیا تو وہ دروازے سے نکل رہی تھی۔ چہرہ بالکل تپا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھی۔ میں چونکا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے عالاں؟'' روتی رہی ہو؟''

پھر وہ ہنسنے لگی۔ پھر ہنسی کے وقفوں میں بولی۔ ''روئیں میرے دشمن۔ میں کیوں روؤں۔ میں تو مرچیں کوٹتی رہی ہوں۔ عارف میاں!''

''تم مرچیں بھی کوٹ لیتی ہو؟''میں نے پوچھا۔''کوئی ایسا کام بھی ہے جو تمہیں کرنا نہ آتا ہو؟ تم اتنے بہت سے کام کیوں کرتی ہو عالاں؟''

وہ بولی۔''روپیہ کما رہی ہوں۔آپ تو جانتے ہیں روپے والے لوگ غریب لڑکیوں کو خرید لیتے ہیں۔میرے پاس روپیہ ہوگا تو مجھ پر نظر اٹھانے کی کسی کو مجال نہیں ہوگی۔ہے کسی کو مجال؟''۔۔۔۔پھر وہ میرے قریب آکر سرگوشی میں بولی۔''میں نے آپ کے لئے کرتے کے لئے ململ خریدی ہے۔اس پر بیل بوٹے کاڑھ رہی ہوں۔''

''یہ غلط بات ہے۔''میں نے احتجاج کیا۔''تمھاری محنت کے کمائے ہوئے روپے سے خریدا ہوا کرتا مجھے کاٹے گا۔''

''میں کسی کو بتاؤں گی تھوڑی۔''وہ بولی۔''آپ بھی نہ بتایئے گا۔پھر نہیں کاٹے گا۔''وہ ٹھٹکی۔پھر ایک دم گھبرا گئی۔ہائے میں مر جاؤں۔کہیں بی بی جی تو نہیں سن رہی ہیں۔''

''بی بی جی''کے لفظ پر میرے جسم میں بھی سنسنی دوڑ گئی۔اندر جھانکا تو صحن خالی تھا۔پھر پلٹ کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔

ٹھیک ہے۔میں نے سوچا۔اچھی لڑکی ہے۔پیاری بھی ہے۔شوخ بھی ہے۔سب کچھ ہے مگر آخر موچی کی لڑکی ہے اور خاندان کے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ بلندی پر کھڑے ہو کر گہرے کھڈ میں نہیں جھانکنا چاہیئے۔توازن بگڑ جاتا ہے اور آدمی گر جاتا ہے۔

ابا کی برسی کے روز ہمارے ہاں پورا گاؤں جمع تھا مگر اس ہجوم میں بھی عالاں کی دوڑ بھاگ نمایاں تھی۔وہ پھرکی کی طرح گھومتی پھر رہی تھی۔یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اگر یہ لڑکی اس ہجوم سے نکل گئی تو برسی کی ساری تنظیم بگڑ جائے گی اور ہر طرف لٹس پڑ جائے گی۔وہ بالکل برمے کی طرح ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی پار ہو جاتی اور پلٹ کر غڑاپ سے امی کے کمرے میں گھس کر کواڑ دھڑ سے بند کر دیتی۔وہاں سے ہدایات لے کر پھر باہر نکلتی اور پھر سے ہجوم میں برما گا دیتی۔عشاء کی اذان تک سارا گاؤں کھانا کھا چکا تھا۔خالی دیگیں ایک طرف سمیٹ دی گئی تھیں۔نائی،میراثی،دھوبی،موچی بھی فارغ کر دیئے گئے تھے۔دن بھر کے ہنگامے کے بعد ایک بہت بھاری سناٹا گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔آخری مہمان کو رخصت کر کے جب میں امی کے کمرے میں آیا تو مجھے یقین تھا کہ عالاں بیٹھی امی کے بازو اور پنڈلیاں دبا رہی ہوگی۔مگر امی تو اکیلی بیٹھی تھیں۔زندگی میں شاید پہلی بار امی کا لحاظ کیے بغیر ان سے پوچھ بیٹھا۔

''عالاں کہاں ہے۔؟''

مگر امی اس سوال سے بالکل نہیں چونکیں۔بولیں۔''وہ لڑکی ہیرا ہے بیٹا۔بالکل ہیرا۔آج تو وہ میری۔آنکھیں،میرے بازو میرا سب کچھ تھی۔دن بھر کی تھکی ماندی تو تھی ہی،کھانے بیٹھی تو دو چار نوالوں کے بعد جی بھر گیا۔اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اسے روکا۔اس دیگچی کو چاولوں سے بھرا اور اسے لے جانے کو کہا تو وہ بولی۔''یہ چاول تو مجھے عارف میاں دیتے ہوئے بھلے لگتے۔اوروں کو رخصت کرتے رہے پر انہوں نے مجھے تو پوچھا ہی نہیں۔میں نہیں لے جاتی۔''اس نے یہ بات ہنسی میں کہی پر اس نے ٹھیک کہا بیٹا۔اندر کا سارا کام اسی نے سنبھالے رکھا۔تم سب کو رخصت کر رہے تھے۔اسے بھی رخصت کرتے۔ویسے تو وہ ہنستی ہنستی چلی گئی ہے پر اسے ہنسنے کی عادت ہے اور

بیٹا جن لوگوں کو ہنسنے کی عادت ہوتی ہے نا انہیں رونا بھی آتا ہے تو ہنسنے لگتے ہیں۔ تب وہ ہنستے ہیں تو اندر سے رو رہے ہوتے ہیں۔ تم نے ایک موچن سمجھ کر عالاں کی عزت نہ کی۔ حالاں کہ عالاں کا اپنا مان ہے اس کا یہ مان قائم رکھو بیٹا اور چاولوں کی یہ دیگچی اسے دے آؤ۔ تھوڑی دیر پہلے گئی ہے۔ سوئی نہیں ہوگی۔ پھر کل صبح تم جا بھی رہے ہو۔ وہ کیا یاد کرے گی تمھیں، جاؤ۔''

عالاں اپنے گھروندے کے دروازے کے پاس چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے پاس جا کر آہستہ سے پکارا تو وہ تڑپ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے اس کے قریب کوئی گولا پھٹا ہے۔

''عارف میاں جی۔'' وہ بولی۔ پھر حسب عادت ہنس کر کہا۔ ''چاول دینے آئے ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔ چاول ہی دینے آیا ہوں۔''

''لائیے'' اس نے ہاتھ بڑھائے۔ ''بی بی جی نے بتایا ہوگا میں نے کیا کہا تھا۔'' وہ ہنسنے لگی۔ ''ہاں بتایا ہے۔'' میں نے کہا۔

دیگچی لے کر اس نے چارپائی پر رکھ دی اور بولی۔ ''وہاں گھر میں دیتے تو زیادہ اچھا لگتا۔ ویسے اب بھی اچھا لگ رہا ہے۔''

کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کہوں۔ آخر ایک بات سوجھی۔ ''میں کل صبح واپس جا رہا ہوں۔''

''وہ مجھے معلوم ہے۔'' عالاں بولی۔

''معلوم تھا تو وہاں گھر میں ذرا سی رک جاتیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''آپ کے کرتے کا آخری ٹانکا باقی تھا۔ وہ آکے لگایا ہے۔ بکسے میں اس کرتے کی جگہ تو ہوگی نا؟ اور ہاں صبح آپ کا بکسا اٹھا کر بسوں کے اڈے پر مجھے ہی تو آپ کو پہنچانا ہے۔ بی بی جی نے کہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم کیا کچھ کر لیتی ہو عالاں۔۔۔ چکی تم پیس لیتی ہو۔۔۔ چھتیں تم لیپ لیتی ہو۔۔۔ مرچیں تم کوٹ لیتی ہو۔ کنوئیں سے دو دو تین تین گھڑے تم پانی بھر لاتی ہو۔ پورے گھر کا کام تم سنبھال لیتی ہو۔ کرتے تم کاڑھ لیتی ہو۔ بوجھ تم اٹھا لیتی ہو۔ تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو عالاں؟''

وہ خاموش کھڑی رہی۔ پھر وہ قدم اٹھا کر میرے اتنے قریب آگئی کہ مجھے اپنی گردن پر اس کی سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ ''میں تو اور بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں عارف میاں۔'' اس کی آواز میں جھنکار سی تھی۔ آپ کو کیا معلوم اور کیا کچھ کر سکتی ہوں۔''

ذرا سے وقفے کے بعد وہ بولی۔ ''مجھ سے پوچھیے نا، میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں۔''

پہلی جماعت کے بچے کی طرح میں نے اس سے پوچھا۔ ''اور کیا کر سکتی ہو؟''

''میں پیار بھی کر سکتی ہوں عارف میاں۔'' اس نے جیسے کائنات کا راز فاش کر دیا۔

(۱۹۷۷ء)